ولی دکنی کی ریختہ گوئی، فسانہ بابت شاہ گلشن اور دہلویت کی بالادستی

ڈاکٹر خاور نوازش، لیکچرر شعبۂ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

Abstract

Wali Deccani is often known as the first entrenched and traditionally established classical poet of Urdu Ghazal. His Deewan (Collection of Ghazals) after its arrival at Delhi settled new horizons in the tradition of rekhta-goi in North India as it introduced a new and wonderful way of expressing one's feelings in local vernacular along with regional themes, imagery, allegory, melodious sounds and metaphors. In other words this was the dawn of invading great north India of "mirzeyan (Mughals) and faseehan" by Deccanis/south Indians through art and inventiveness in local language (Urdu/Hindi). Being a challenge to the supremacy of North Indian poets and writers on language and classical poetic tradition of India, it was quite unacceptable for North Indians. The subsequent historians and especially 'tazkara' writers of Delhi like Meer Taqi Meer and Qaem Chandpuri propagated the renowned theory regarding a Persian poet of that time Shah Gulshan's suggestion to Wali to write in local dialect and adopt local themes for his ghazal. This was just to maintain the authority and supremacy regarding use of language and poetical creativity of 'Dehalviat' over 'Deccaniat'. This article presents a research and analysis of this formulated theory.

اورنگ زیب عالمگیر کی فتحِ دکن کے بعد شمالی اور جنوبی ہند کے رابطے بحال ہوئے۔ شمال والوں کے لیے یہ بات حیرت انگیز تھی کہ جس کھڑی بولی کو وہ اب تک ادبی زبان کے معیار سے کم تر سمجھتے تھے اُس کی بڑی مستحکم ادبی روایت جنوب میں موجود تھی۔ شمال میں اُس کھڑی بولی کے جو تھوڑے بہت ادبی نمونے موجود تھے انھیں ریختہ کے نمونے کہا جاتا تھا۔ 'ریختہ' کی وضاحت میں شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''یہاں [شمال میں] جب ''ہندی/ہندوی'' میں ادب لکھا جانے لگا تو سب سے پہلے اس زبان میں جسے ''ریختہ'' کا نام ملا (واضح رہے کہ گجرات اور اوائلی دکن میں ''ریختہ'' کا پتا نہیں۔ یہ شمال کی چیز ہے)۔ پہلے پہل تو اس کلام کو ''ریختہ'' کہا گیا جو فارسی/ہندی ملی جلی زبان میں لکھا جاتا

تھا۔ بعدہٗ وہ زبان بھی ریختہ کہلائی جس میں وہ کلام بنایا جاتا تھا۔ پھر ہر وہ کلام جسے ریختہ میں لکھا جائے' ریختہ کہلانے لگا۔ لفظ ''ریختہ'' سے ایک صنفِ شعر مراد لینے، یا ''زبان ریختہ'' میں کہے ہوئے کلام کے لیے ''ریختہ'' کا لفظ استعمال کرنے کی مثال انیسویں صدی کے وسط تک ملتی ہے۔ اسی طرح، اسم زبان کے طور پر ''ریختہ'' اور ''ہندی'' دونوں ہی انیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک رائج رہے..... ریختہ کے کئی معنی ہیں۔ مثلاً (۱) ملا جلا، (۲) گارے اور چونے کا مسالہ جو عمارت بنانے کے کام آتا ہے، (۳) پڑا گرا، (۴) کوئی چیز جو کسی اور چیز میں ڈھالی جائے، وغیرہ۔ لہٰذا ''ریختہ وہ زبان ٹھہری جس میں فارسی کے تنے پر ''ہندی'' کی شاخیں لگائی جائیں یا پھر جس میں ''ہندی'' کے تنے پر فارسی کی شاخیں لگائی جائیں۔''[۱]

شمال میں ریختہ گوئی کی روایت کے آغاز پر 'ریختہ' کو غزل سے الگ صنف / طرز سمجھا جانا بھی ثابت ہوتا ہے۔ اُس وقت غزل کے لیے فارسی زبان مخصوص تھی۔ شمال میں ریختہ (بمعنی اسم زبان) میں غزل گوئی کا باقاعدہ آغاز ۱۷۲۰ء میں ولؔی دکنی کا دیوان شمالی ہند پہنچنے کے بعد ہوا۔ اب تک کی تحقیق کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہیں کہ شمالی ہندوالوں نے ریختہ میں غزل کہنا دراصل ولؔی سے ہی سیکھا۔ ولؔی کا کلام دہلی پہنچنے سے قبل جس ریختہ کا وجود تھا وہ ایک صنف تھی۔ ولؔی کے ہندی / ہندوی / دکنی کلام کو دیکھ کر دہلی کے شعرا کو یہ احساس ہوا کہ جس زبان کو انھوں نے اب تک شاعری کے قابل نہ سمجھا تھا اُسے نہایت عمدگی کے ساتھ تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا گیا تھا۔ ہندی میں مکمل ادبی وسیلہ بننے کے وسیع تر امکانات کا احساس شمال کی فضا میں ایک ادبی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اٹھارویں صدی کے دہلی میں فارسی غزل کی مقبولیت کا دور ختم ہوا اور اُردو غزل گوئی کی روایت شروع ہوئی لیکن اُس غزل کو زبان کی مناسبت سے ہندی غزل پھر بھی نہیں کہا گیا۔ اٹھارویں صدی کے اوائل برسوں کو ہندوستان کی ادبی تاریخ کا ایسا موڑ سمجھا جا سکتا ہے جس پر حکمرانوں کی زبان کی جگہ عوام کی زبان حاصل کر لیتی ہے لیکن اسے اصل نام ہندی نہیں بلکہ مصنوعی نام 'ریختہ' سے پکارا گیا۔ 'ہندی' نام نہ دینے کی پہلی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ عام طور پر اَن پڑھوں، مفتوحین یا دیہی علاقوں کے لوگوں کی زبان کا نام ہندی / ہندوی رائج تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ 'ریختہ' میں فارسی کی ملاوٹ کا تیقن واضح رہتا ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

''دہلی والے ایک انداز مطلق العنانی اور سامراجی شان کے ساتھ اُردو کی بادشاہی کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے شہر کے لیے اُردو کے اصل اور قدیمی دارالخلافہ کا لقب استعمال کرتے ہیں، اور اپنی زبان کو ''مستند ترین'' اور قاعدہ پرداز (normative) جانتے ہیں۔ لیکن تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ دہلی نے اُردو کو اس کے اصل روپ (خواہ وہ خود دہلوی ہو، یا گجری، یا دکنی) میں منھ نہ لگایا۔ اٹھارہویں صدی کی دہلی میں اُردو مقبولیت کی منزلیں طے کرنے لگی، لیکن اس کا نام پھر بھی ''ریختہ'' ہی رہا۔ مناسب تو یہ تھا کہ اب اسے صرف ''ہندی'' کے نام سے پکارا جاتا، جو اس کا صحیح

نام تھا۔لیکن فارسی کے حق میں جانب داری، اور قدیم اُردو، یعنی ''دکنی/ ہندی/ ہندوی'' کے خلاف پرانے تعصب کے باعث،ادبی زبان کے لیے ''ریختہ'' ہی نام رائج ہوا۔''[۲]

گویا 'ریختہ' نام دہلی کی ادبی تہذیب میں خود پسندی اور تعصب کی وجہ سے برقرار رہا۔شمس الرحمٰن فاروقی اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اپنے گجری/دکنی ماضی کو بھلانے' یا اس کا اثر کم کرنے کی خاطر' یا پھر اس کے خلاف دفاعی کارگذاری کے طور پر' دہلی کی ادبی تہذیب نے اپنے اندر ایک طرح کی انانیت اور رعونت پیدا کی، اور گجری/دکنی کو اپنے سے الگ، یا کمتر اور ناقابل لحاظ، قرار دینے کی رسم شروع ہی سے آغاز کر دی۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ رعونت اور استثنا پذیری، یعنی exclusionism کا یہ رویہ دہلی والوں نے تمام غیر دہلوی اُردو ادب اور زبان کے لیے بھی شروع ہی میں اختیار کر لیا۔''[۳]

غیر دہلوی اُردو ادب میں نمایاں حصہ دکنی ادب کا ہے اور اس کا سب سے بڑا اور اہم شاعر ولؔی دکنی ہے۔ ولؔی کو شمالی ہند کے تمام تذکرہ نگار ریختہ گو لکھتے ہیں لیکن ساتھ ہی اُن کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں کہ شمال والوں کے لیے وہ کوئی غیر ملکی ہوں۔ولؔی سے ایک ایسا واقعہ بھی منسوب ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کی ریختہ گوئی کے اعتبار کا سبب دہلی (شاہجہاں آباد) یا ترا ہے۔یہ واقعہ ولؔی کی شاہ سعداللہ گلشنؔ سے ملاقات پر مبنی ہے۔میر تقی میرؔ 'نکات الشعرا' میں لکھتے ہیں:

''[ولی] شاعر ریختہ از خاک اورنگ آباد است۔میگو یند کہ در شاہجہاں آباد دہلی نیز آمدہ بود۔بخدمت میاں گلشن صاحب رفت، واز اشعار خود پارۂ خواند۔میاں صاحب فرمود، این ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند، در ریختہ خود بکار ببر، از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت۔''[۴]

یعنی میاں گلشن نے فرمایا کہ فارسی کے بیکار پڑے ہوئے مضامین کو 'اپنے ریختہ' میں استعمال کرو' تم سے محاسبہ کون کرے گا۔شمس الرحمٰن فاروقی بتاتے ہیں کہ قائم چاند پوری نے اپنے تذکرے 'مخزنِ نکات' میں یہ واقعہ اس طرح لکھا ہے:

''شاہ ولی اللہ.....مشہور شاعر ہیں.....بادشاہ عالم گیر کے چوالیس سالہ جلوس میں ایک سید پسر ابوالمعالی کے ہمراہ، جس کے ساتھ ان کو شیفتگی تھی، جہان آباد آئے۔کبھی کبھی فارسی میں دو تین شعر اس کے حسن و جمال کی تعریف میں کہہ لیتے تھے۔یہاں آکر جب حضرت شاہ گلشن کی خدمت میں باریاب ہوئے تو انھوں نے ریختہ گوئی کے لیے حکم دیا اور تعلیم کی غرض سے یہ مطلع کہہ کر ان کے حوالے کیا:

خوبی اعجاز حسن یار اگر افشا کروں
بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں

الغرض حضرت کی زبان کا فیض تھا کہ ولی کے کلام نے اتنا حسن قبول پایا کہ ان کے دیوان کا ہر شعر

مطلع آفتاب سے بھی روشن ہے۔اور ریختہ اس قدر فصاحت و بلاغت سے کہا کہ اس دور کے اکثر اساتذہ ریختہ کہنے لگے۔''۵

شمس الرحمٰن فاروقی نے اِس واقعے کو افسانہ قرار دیتے ہوئے اِس کی صحت سے بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔انھوں نے اپنی کتاب 'اُردو کا ابتدائی زمانہ' میں اس واقعے پر تحقیق کے بعد مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے ہیں۶:

(ا) ولؔی کی دہلی آمد (۱۷۰۰ء) کے وقت میرؔ اور قائمؔ دونوں ہی ناپید تھے، لہٰذا ولؔی کے بارے میں ایک کی معلومات دوسرے سے زیادہ نہ تھی۔دونوں نے سنی سنائی پر بھروسہ کیا۔

(ب) ولؔی دہلی آنے کے بعد شاہ گلشن سے ملاقات کو گئے لیکن یہ اُن کی پہلی ملاقات نہیں ہوسکتی۔قوی امکان ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تھے لیکن یہ رشتہ ریختہ میں اُستادی شاگردی کا بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ شاہ گلشن فارسی کے اچھے شاعر تھے اُن کی ریختہ گوئی برائے نام ہی تھی۔ولؔی نے اپنا اُستاد حسن شوقؔی کو مانا اور اپنے پیش رَو اُردو/ہندی/دکنی شعرا میں سے صرف انھی کا ذکر اپنے اشعار میں کیا ہے۔

(ج) قائمؔ کا یہ خیال درست نہیں کہ ولؔی نے ریختہ گوئی شاہ گلشن سے ملاقات کے بعد شروع کی۔ولؔی کے ہر شعر کا زمانہ تو وثوق سے نہیں بتایا جا سکتا لیکن کچھ اشعار میں ۱۷۰۰ء سے پہلے کے لوگوں کا تذکرہ اور ناصرؔ علی سرہندی ایسے قادر الکلام فارسی شاعر کو للکارنے کا اعتماد شہادت دیتا ہے کہ وہ شاہ گلشن سے ملاقات (۱۷۰۰ء) سے قبل بھی باقاعدہ شاعر تھے۔

(د) ولؔی کا سالِ وفات داخلی شہادتوں کی بنا پر ۱۷۰۷ء یا ۱۷۰۸ء قرار پاتا ہے۔دہلی کے تذکرہ نگار اُن کا سالِ وفات ۱۷۰۰ء کے بعد آگے سے آگے اس لیے لے جانا چاہتے ہیں تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ ولؔی نے دہلی کے ریختہ گویوں کے اشعار پڑھ کر اور سن کر شعر کہنا سیکھا اور اُن کی تقلید میں ریختہ گوئی کی۔شاہ گلشن سے مشورہ ملنے کے بعد ولؔی جتنا زیادہ سے زیادہ عرصہ جیے ہوں اتنا ہی اچھا ہے تاکہ 'دہلوی مشورے' کا احسان ثابت ہو جائے۔صرف اسی صورت ولؔی کے اپنے کارنامے کی توقیر کم سے کم اور دہلویت کی توقیر زیادہ سے زیادہ ٹھہرے گی۔

مندرجہ بالا نکات ولؔی کے فنِ شاعری کے باب میں نہایت اہم ہیں اور تحقیق کی روشنی میں بڑی حد تک درست بھی ہیں۔شمس الرحمٰن فاروقی نے شاہ گلشن کے متذکرہ مشورے کے انداز پر تو غور کیا ہے لیکن ایک نکتہ اُن کی نظر سے چھوٹ گیا ہے اور وہ ہے مشورے کی نوعیت۔بقول میرؔ: شاہ گلشن نے ولؔی سے کہا کہ ''یہ سب مضامینِ فارسی، کہ بیکار پڑے ہیں' انھیں اپنے ریختہ میں استعمال کرو' تم سے اس بات پر محاسبہ کون کرے گا''۔اس بیان کے تین حصے ہیں جن کی الگ الگ تعبیر ہونی چاہیے:

اوّل: ''یہ سب مضامینِ فارسی' کہ بیکار پڑے ہیں'' سے بظاہر یہ لگتا ہے کہ مضامینِ فارسی کو شاہ گلشن کارآمد نہیں سمجھتے۔کارآمد کی تعبیرات شاہ گلشن کے حوالے سے نہیں بلکہ میرؔ (راوی) کے حوالے سے ہونی چاہئیں

کیونکہ جو شخص خود فارسی شاعر کی حیثیت سے معتبر مقام رکھتا ہو وہ فارسی مضامین کو بے کار کیونکر کہے گا۔ اغلب ہے کہ میرؔ کو ہی اُس دور کے مضامین بے کار محسوس ہوئے ہوں۔

دوم: ''انھیں اپنے ریختہ میں استعمال کرو'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ ولؔی کا ریختہ الگ تھا اور شاہ گلشن کا الگ۔ ۱۷۰۰ء میں شاہ گلشن کے 'ریختہ' کا مطلب شاعری کی وہ صنف ہے جس میں بقول فاروقی فارسی کے تنے پر ہندی کی شاخیں یا ہندی کے تنے پر فارسی کی شاخیں لگائی جائیں جبکہ ولؔی کے 'ریختہ' سے مراد وہ دکنی زبان ہے جس میں ولؔی ۱۷۰۰ء سے پہلے بھی شعر کہہ رہے تھے۔ میرؔ (راوی) کے حوالے سے اس بیان کی یہ تعبیر کی جاسکتی ہے کہ شمالی ہند والوں کے لیے 'دکنی' ایک الگ / مختلف ریختہ تھی۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے بھی یہی بات کی ہے کہ اگر دہلی کی اُردو دکن کی زبان سے اُس وقت مختلف نہ ہوتی تو شیخ سعداللہ گلشن ولؔی کو ہرگز یہ مشورہ نہ دیتے۔[۷]

سوم: ''تم سے اس بات پر محاسبہ کون کرے گا'' کی تعبیر با آسانی 'مضامینِ فارسی پر ڈاکا زنی کی ترغیب دلانا' کی جاسکتی ہے۔ اگر شمالی ہند کا کوئی شاعر مضامینِ فارسی پر ڈاکا ڈالتا تو اُس سے پورا پورا حساب لیا جاتا کیونکہ شمال میں فارسی کا راج تھا، بڑے فارسی گو شعرا یہاں موجود تھے، قلعہ معلیٰ فارسی کا گھر تھا۔ لیکن جنوبی ہند میں کسے معلوم کہ یہ مضامین فارسی میں نظم ہو چکے ہیں۔ دوسری تعبیر یہ بھی کی جاسکتی ہے کہ شاعری کے لیے اصل مضامین فارسی گویوں کے ہاں موجود ہیں، دکن کے مضامینِ شاعری کم تر درجے کے ہیں، شمال کی فارسی شعری روایت میں یہ مضامین کھپ چکے ہیں اور یہاں والوں کے لیے اب بیکار ہیں سو انھیں اپنے ریختہ میں اپناؤ۔ میرؔ (راوی) کے حوالے سے بھی قوی تعبیر یہی بنتی ہے۔

بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو ولؔی کو شاہ گلشن کی طرف سے ملنے والے مشورے (اگر واقعتاً ایسا ہی ہوا تھا) سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ ولؔی ۱۷۰۰ء سے پہلے شعریات کے اُس احساس سے روشناس ہی نہیں تھے جو اُن کی شاعری کا خاصا ہے اور یہ احساس اُن کی ذات میں دہلویت کی بدولت ہی پیدا ہوا۔ دوسرے لفظوں میں اس واقعے سے یہ باور کرانے کی کوشش جاتی ہے کہ ولؔی اگر دہلی نہ آتے تو ولؔی نہ بن پاتے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شاہ گلشن کے مشورے کے بعد (اپنی وفات ۰۸-۱۷۰۷ء تک) صرف سات آٹھ برسوں میں ہی ولؔی نے ریختہ کا وہ دیوان لکھ دیا جو اسے امر کر گیا۔ اتنے کم عرصے میں یہ کیونکر ممکن ہے؟ اس سوال کا جواب مثبت نہ ملنے کی صورت میں یہ نتیجہ نکالنا بھی قطعی طور پر درست نہ ہوگا کہ ولؔی کی شاہ گلشن سے کوئی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ ملاقات قرینِ قیاس ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دکن کی شعری روایت سے ولؔی کا گہرا رشتہ اور اُن کی شاعری کا لسانی پہلو انھیں اٹھارویں صدی کی دہلوی فصاحت سے ہر طرح الگ رکھتا ہے۔ ایک غزل ملاحظہ کیجیے:

ترے بن مجکوں اے ساجن تو یو گھر بار کرنا کیا　　اگر تو نا چہے مجکوں تو یو سنسار کرنا کیا
مندے گھر واسوں باہر کر اپس کے آپ منصف ہو　　نکارا تیو چھ بک بک کر اِتا بیزار کرنا کیا

اگے جب سوں نہ آنے کی تھی منسا من میں تمنا کے تو مجھسے دکھ بھرے سوں پھر جھٹا اقرار کرنا کیا
پیتارا نہیں ترے کہے کا تو چپ حیران کرتا ہے جو من میں نہیچھ ملنے کا تو پھر تکرار کرنا کیا
ترے آنے کی بات اوپر پچھایا ہوں انکھاں اپنی تو بیگی آ کہ تجھ بن مجھکو یہ گھر بار کرنا کیا
تمہیں ملنے سوں گر اپنے سہاگن نا کرو گے مجھ تو جوڑا لگجری کا اور کریلا دھار کرنا کیا
جوکوئی جالے پرت کی آگ میں تن من کو یوں اپنے ولی سنگم بنا ایسے کوں پھر آدھار کرنا کیا[۸]

ولؔی کی اس غزل کے لسانی پہلو پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ کوئی ایک شعر بھی ایسا نہیں جس میں سنسکرت، پراکرت اور فارسی الفاظ کے علاوہ پنجابی کے وہ اثرات موجود نہ ہوں جو دکن اور دہلی کی زبان کے بیچ امتیاز واضح کرتے ہیں۔ یہ صرف ایک غزل ہے، ولؔی کا پورا کلام بھی اُٹھا کر دیکھ لیں تو اُس کے ہاں اٹھارویں صدی کی دہلویت سے ایک فاصلہ برقرار رہتا ہے۔اس تمام بحث کا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ دخیل الفاظ کی بنا پر ہندی/ہندوی نے اُردو کا مخصوص رنگ بلاشبہ اٹھارویں صدی کے اوائل برسوں میں اختیار کرنا شروع کیا لیکن ولؔی دکنی کے بعد۔ ولؔی اُس تسلسل کا آخری نمائندہ ہے جس کی پہلی کڑی شمس العشاق شاہ میراں جی کو کہا جاسکتا ہے۔جنوب میں جب دکنی شاعری کو عروج حاصل تھا تب شمال کے شعرا فارسی کو تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے لیکن شمال میں عوامی سطح پر اور دیہی علاقوں میں جو زبان بولی جاتی تھی وہ لہجے کے معمولی فرق کے ساتھ بالکل وہی تھی جس میں جنوب میں شعر و ادب تخلیق ہو رہا تھا۔شمال اور جنوب کی زبان میں یکسانیت کے نمونے افضلؔ کی 'بکٹ کہانی' کے علاوہ چند دیگر ایسی تصانیف میں تلاش کیے جاسکتے ہیں جو لکھی تو کھڑی بولی میں ہی گئی تھیں لیکن کچھ غیر ادبی موضوعات اور اغلباً فارسی کا راج ہونے کی وجہ سے منظر نامے پر معتبر جگہ نہ بنا سکیں۔ ولؔی دکنی کی شاعری عوامی زبان میں ہے۔ اُس میں دخیل الفاظ کا وہ رنگ جو اصلاحِ زبان کی تحریک سے مخصوص ہے، نہایت دھیمی جھلک لیے ہوئے ہے۔ ولؔی کی شعری زبان کے ساتھ جو بھی کھلواڑ ہوا وہ اُن کے انتقال کے بہت بعد کی داستان ہے۔ اُستادانِ فصاحت نے ولؔی کے کلام میں بھی اصلاحیں کیں اور نئے قلمی نسخے تیار کیے گئے۔ دیوانِ ولؔی کا اب تک دریافت شدہ قدیم ترین نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے جس پر تاریخ ۲۶/ربیع الاوّل، ۱۱۲۰ ہجری (مطابق ۱۵/جولائی ۱۷۰۸ء) درج ہے اور اس مخطوطہ میں وہ سارا کلام محفوظ ہے جو ولؔی سے منسوب ہے[۹]۔ اس مخطوطے کو اب کم و بیش تین سو برس بیت چکے ہیں۔اس دوران ولؔی کے کلام کے جتنے مختلف نسخے شائع ہوئے، جتنے مختلف لوگوں نے اسے ترتیب دیا اور جتنے ایڈیشنز منظرِ عام پر آچکے ہیں اُن سب کی تعداد کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ ولؔی کے کلام میں کوئی تبدیلیاں کی گئی ہوں۔ ۱۸۷۵ء میں لکھے گئے ایک مقالے میں معروف مستشرق گارساں دتاسی بتاتے ہیں کہ بمبئی سے 'دیوانِ ولی' کا ایک ایسا ایڈیشن بھی شائع ہوا جس میں ناشروں نے کلامِ ولی پر اصلاح دی ہوئی تھی۔ لکھتے ہیں:

> ''دیوان ولؔی کا ایک ایڈیشن حال ہی میں بمبئی سے شائع ہوا ہے۔ میرا قیاس ہے کہ مرتب اس نسخے سے واقف نہ تھا جو میں نے پیرس سے ۱۸۳۳ء میں شائع کیا.....بمبئی کے نسخے کے دیباچے

میں کہا گیا ہے کہ ''دیوان کا کوئی قلمی نسخہ کتابت کی غلطیوں سے خالی نہیں۔ لیکن اسے دو چار نسخوں کے مقابلے کے بعد مرتب کیا گیا ہے اور حسبِ ضرورت متن کی تصحیح بھی کی گئی ہے''۔ یعنی تبدیلیاں کر دی گئی ہیں۔ اس کا پتہ آسانی سے چل جاتا ہے اس نام نہاد اصلاح کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ نئے ناشروں کا خیال تھا کہ ولی کے دیوان میں بعض متروک الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ولی کے عصر کو دیکھتے ہوئے اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں۔ ناشروں کی رائے میں ولؔی کے ہاں الفاظ کا غلط استعمال بھی ہوا ہے۔ شمالی ہند کی موجودہ بولی کو دیکھتے ہوئے یہ بات صحیح ہو سکتی ہے لیکن دکھنی پرانی زبان کے دیکھتے ہوئے یہ اعتراض غلط ہے۔ ولؔی کے اشعار کے مندرجات کی (شاعرانہ) اہمیت میں اس کے قدیم اسلوب کے باعث ایک مزید اہمیت تاریخ الفاظ (یا لسانیات) کے نقطہ نظر سے پیدا ہو جاتی ہے..... بمبئی کے ایڈیشن میں میرے طریقے کے برعکس ولؔی کو نیا لباس پہنانے اور اس کے کلام کو ''شمالیانے'' (یعنی شمالی ہند کی بولی کے مطابق بنانے) کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اس طرح ناشروں نے اسے مسخ کر دیا ہے۔ اس میں یہی نہیں کہ جدید صرف ونحو کا استعمال کیا گیا ہے بلکہ بہت سے ہندی الفاظ کو نکال کر ان کی جگہ ایسے فارسی الفاظ رکھ دیے گئے ہیں جو شمالی ہند زیادہ میں رائج ہیں۔''[۱۰]

بمبئی سے شائع ہونے والے نسخے کو ناشروں نے اپنی دانست میں اغلاط سے پاک کرنے کی کوشش کی۔ گارساں دتاسی کا مندرجہ بالا بیان دیوانِ ولؔی کے آخری متذکرہ نسخے (۱۷۰۸ء) کے ایک سو ستّر برس بعد کا ہے جب اصلاحِ زبان کی تحریک کا جوش ٹھنڈا پڑ چکا تھا' کلاسیکی شعری روایت کے آخری بڑے نمائندہ شاعر غالبؔ دنیا سے رُخصت ہو چکے تھے اور اب سرسید کی قیادت میں اُردو زبان کو ایک نئے اسلوب سے روشناس کرانے کی تحریک زوروں پر تھی۔ اگر اُس دور میں بھی اُردو زبان کو 'شمالیانے' کی کوششیں ہو رہی تھیں تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں رہتا کہ ماضی میں جب ایک باقاعدہ تحریک کی صورت میں اصلاحِ زبان کا عمل جاری تھا تو ولؔی کے کلام کو 'دہلویت' کا مرہونِ منت بنانے کی کتنی کوششیں کی گئی ہوں گی۔ ولؔی تو پھر شمال والوں کے لیے غیر ملکی تھے مصلحین (جن میں زیادہ تر بڑے شعرا کے شاگرد شامل تھے) نے تو مصحفیؔ اور ناسخؔ کو بھی نہیں بخشا جو بجائے خود فصحا میں شامل تھے' اُن کے شعروں میں بھی شاگردوں نے بغرضِ صحت کئی تبدیلیاں کیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی تحقیق کی روشنی میں ولؔی کی تاریخ وفات ۱۷۲۰ء اور ۱۷۲۵ء کے بیچ مانتے ہیں[۱۱] اور کلامِ ولؔی کی زبان کی [صفیر بلگرامی سے اتفاق کرتے ہوئے] تین قسمیں بتاتے ہیں[۱۲]:

اوّل: جس میں دکنی، گجری اور ہندوی الفاظ کی کثرت ہے۔

دوم: جس میں دکنی کے چند مخصوص الفاظ کے علاوہ باقی شمالی ہند کی زبان ہے۔

سوم: جس میں ہمارے دور (ناسخؔ سے زمانہ حال تک) کی لسانی بازگشت موجود ہے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ ولؔی کے کلام میں اُس کے مستقبل بعید کی زبان کی بازگشت بھی جمیل جالبی صاحب محسوس کر سکتے ہیں یعنی اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ولؔی دکنی کے ہاں سولہویں صدی عیسوی کی 'دکنی' سے لے کر انیسویں صدی عیسوی کی 'اُردوئے معلیٰ' تک کا لسانی ارتقا موجود ہے جو ظاہر ہے کہ صرف اسی صورت ہو سکتا ہے جب اُس کی وفات کے بعد بھی زمانے کے تقاضوں کے مطابق کلام کی اِصلاح و ترتیب ہوتی رہے۔

امرت رائے نے ہندی/ہندوی میں سے سنسکرت اور عام بول چال کے پراکرت الفاظ نکال کر عربی اور فارسی الفاظ داخل کرنے کی روایت کا آغاز ولؔی دکنی سے سمجھا ہے[۱۳] جو کہ درست نہیں۔ ایسا سمجھنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ولؔی کو ایک شعر کی داخلی شہادت کی بنا پر محمد شاہ کے ابتدائی عہدِ شاہی (۲۰۔۱۷۱۹ء) میں دوسری دفعہ دہلی کے بازاروں میں گھومتا ہوا دیکھتے ہیں۔ شعر ملاحظہ کریں[۱۴]:

دِل ولی کا لے لیا دِلّی نے چھین
جا کوئی کہیو محمد شاہ سوں

اوّل تو یہ شعر ولؔی سے غلط طور پر منسوب ہے اور اس کا اصل خالق شمالی ہند کا معروف ایہام گو شاعر شیخ شرف الدین مضمونؔ ہے، دوم درست شعر یوں ہے[۱۵]:

اس گدا کا دِل لیا دِلّی نے چھین
کوئی کہے جا کر محمد شاہ سوں

اور سوم یہ کہ ولؔی کا اپنے دیوان کے ساتھ دہلی آنا ثابت نہیں ہوتا۔ بقول مصحفیؔ، شاہ حاتمؔ نے محمد شاہ کے عہد [فردوس آرام گاہ کے سنہ دوم] (۲۰۔۱۷۹۱ء) میں ولؔی کا کلام شاہجہاں آباد/دہلی پہنچنے اور اشعار چھوٹے بڑے کی زبان پر جاری ہونے کی بات کی ہے[۱۶] لیکن یہ نہیں کہا کہ ولؔی بھی اس کلام کے ہمراہ دہلی آئے۔ محمد شاہ کے عہد میں ولؔی کی دہلی آمد کو شاہ سعد اللہ گلشن کے مشورے سے ریختہ گوئی شروع کرنے والے افسانے کا دوسرا حصہ سمجھا جانا چاہیے۔ امرت رائے کا خیال اس لیے بھی درست نہیں کیونکہ ولؔی کی زبان 'اورنگ آبادی اُردو' ہے، اُس میں فارسی (بشمول عربی) کے الفاظ کا تناسب اتنا ہی ہے جتنا اورنگ آباد کے سلطنتِ مغلیہ کا حصہ بننے کے بعد فطری طور پر ہو سکتا تھا۔ ولؔی کو شاہ گلشن سے ملاقات والے ایک واقعے کی بنا پر ریختہ گوئی کی روایت کے اس حصے میں شامل کرنا جہاں ہندی الفاظ ترک کر کے فارسی الفاظ شامل کرنے کی روش مستحکم ہوئی، نہ صرف تاریخی غلطی ہوگی بلکہ اُسے مخصوص معنوں میں شاہجہاں آبادیت/دہلویت کا ممنونِ احسان کرنے کی کوشش بھی سمجھی جا سکتی ہے۔ امرت رائے کی طرف سے ولؔی اور اُن کے کلام کو بھی اُسی عینک سے دیکھنے کی کوشش جس سے خان آرزوؔ، شاہ حاتمؔ، مرزا مظہرؔ، میرؔ، سوداؔ اور قائمؔ وغیرہ کو دیکھا گیا ہے انتہائی غلط ہے۔ ولؔی اُس دکنی شعری روایت کے آخری چشم و چراغ ہیں جو دہلویت کی بالادستی تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے اپنی اُس منفرد لسانی و شعری پہچان کو برقرار رکھتی ہے جس میں مقامیت کا عنصر زیادہ ہے۔ پوری بحث کے نتیجے کے طور پر مندرجہ ذیل نکات اخذ کیے جا سکتے ہیں:

☆ ولؔی اپنی زندگی میں صرف ایک دفعہ ۱۷۰۰ء میں دہلی آئے۔۱۷۲۰ء میں ولؔی کا جب ولؔی کا دیوان دہلی پہنچا تو اس سے تیرہ برس پہلے ہی وہ وفات پا چکے تھے۔

☆ ۱۷۰۰ء میں دہلی آمد پر شاہ سعداللہ گلشؔن سے ولؔی دکنی کی ملاقات قرینِ قیاس ہے لیکن یہ ملاقات سرسری نوعیت کی ہوگی۔شاہ گلشؔن کا ولؔی کو مشورہ دینا کہ شعر یوں کہو اور فلاں مضامین اپناؤ اور پھر جنوبی ہند واپس پہنچ کر ولؔی کا اُس مشورے پر عمل کرتے ہوئے صرف سات آٹھ برسوں میں ہی ایک دیوان لکھ دینا ایک ایسا فسانہ ہے جو دہلی والوں نے صرف اس لیے تراشا کہ مستقبل کا مورخ یہ نہ لکھے کہ ایک ''جنوب والے'' نے ''شمال والوں'' کو ریختہ گوئی سکھائی۔ولؔی کو اگر شاہ گلشؔن کے مشورے نے ولؔی بنایا ہوتا تو وہ اس کا ذکر کہیں نہ کہیں ضرور کرتے لیکن انھوں نے کہیں بھی شاہ گلشؔن کو اپنا اُستاد نہیں مانا۔تاہم حسن شوؔقی کا ذکر اپنے استاد کی حیثیت سے ضرور کیا ہے۔

☆ ولؔی کی ریختہ گوئی اُن کے متاخرینِ دہلی سے الگ اپنی لسانی وشعری خاصیت کی حامل تھی جسے ''دکنیت کا عنصر'' کہا جانا چاہیے۔اُن کے ہاں موجود'' دہلویت''بڑی حد تک اصلاحِ زبان کی تحریک کے علمبرداروں،اُن کے شاگردوں اور شمالی ہند کے پبلشرز کا کارنامہ ہے جنھوں نے اپنی دانست میں کلامِ ولؔی کی اصلاح کر کے ہندی الفاظ اور محاورے نکالے اور فارسیت کا رنگ چڑھایا۔اُردو میں اصلاحِ زبان کی تحریک کو دہلوی بالادستی قائم رکھنے کی تحریک بھی کہا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ فاروقی،شمس الرحمٰن، اُردو کا ابتدائی زمانہ: ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو،(کراچی:آج کی کتابیں،۲۰۰۱ء،دوسرا ایڈیشن)،ص:۱۱۴۔۱۱۵

۲۔ ایضاً،ص:۱۱۷

۳۔ ایضاً،ص:۱۱۸

۴۔ میرؔ،تقی میر،نکات الشعرا،مرتبہ:مولوی عبدالحق،(اورنگ آباد:انجمن ترقی اُردو،۱۹۳۵ء)،ص:۸۹۔۹۰

۵۔ قائمؔ چاندپوری،قیام الدین، مخزن نکات،تلخیص واُردو ترجمہ:عطا کاکوی،(پٹنہ:عظیم الشان بک ڈپو،۱۹۴۸ء)،ص:۱۰۵

۶۔ اُردو کا ابتدائی زمانہ: ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو،ص:۱۲۵۔۱۳۹

۷۔ سبزواری،شوکت،ڈاکٹر، داستانِ زبانِ اُردو،(کراچی:انجمن ترقی اُردو پاکستان،۱۹۸۷ء، اشاعت دوم)،ص:۱۸۶

۸۔ کلیاتِ ولی،مرتبہ:احسن مارہروری،(اورنگ آباد دکن:انجمن اُردو پریس،اُردو باغ،۱۹۲۷ء)،ص:۵۶

۹۔ بحوالہ:اُردو کا ابتدائی زمانہ' ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو،ص:۱۲۷

۱۰۔ دتاسی،گارساں،مقالہ۱۸۷۵ء،مترجمہ:ڈاکٹراختر حسین رائے پوری،بنظرِثانی:ڈاکٹرحمیداللہ،مشمولہ:مقالات گارساں دتاسی،جلددوم،(کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان،۱۹۷۵ء،طبع دوم)،ص:۲۶۰۔۲۶۲

۱۱۔ جالبی،جمیل،ڈاکٹر،تاریخِ ادبِ اُردو،جلداوّل،(لاہور:مجلس ترقی ادب،۲۰۰۸ء،طبع ہفتم)،ص:۵۳۹

۱۲۔ تاریخِ ادبِ اُردو،جلداوّل،ص:۵۵۱

۱۳۔ Rai. Amrit, *A House Divided: The origin and Development of Hindi/Hindvi*, (Delhi: Oxford University Press, 1984), p.238

۱۴۔ Ibid. P.248

۱۵۔ بحوالہ: تاریخِ ادبِ اُردو،جلددوم،ازڈاکٹرجمیل جالبی،(لاہور:مجلس ترقی ادب،۲۰۰۹ء،طبع ششم)، ص:۲۶۱

۱۶۔ مصحفی،غلام ہمدانی،شیخ،تذکرۂ ہندی،مرتبہ:مولوی عبدالحق،(اورنگ آباد:انجمن ترقی اُردو پریس،۱۹۳۳ء)،ص:۸۰

مآخذ:

۱۔ جالبی،جمیل،ڈاکٹر،تاریخِ ادبِ اُردو،جلداوّل،لاہور:مجلس ترقی ادب،۲۰۰۸ء،طبع ہفتم۔

۲۔ دتاسی، گارساں،مقالہ ۱۸۷۵ء،مترجمہ: ڈاکٹراختر حسین رائے پوری،بنظرِ ثانی: ڈاکٹر حمید اللہ، مشمولہ:مقالات گارساں دتاسی،جلددوم،کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان،۱۹۷۵ء،طبع دوم۔

۳۔ فاروقی،شمس الرحمٰن، اُردو کا ابتدائی زمانہ: ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو،کراچی: آج کی کتابیں،۲۰۰۱ء،دوسرا ایڈیشن۔

۴۔ قائم چاندپوری،قیام الدین، مخزن نکات،تلخیص واُردو ترجمہ:عطا کاکوی،پٹنہ:عظیم الشان بک ڈپو،۱۹۴۸ء۔

۵۔ میر،تقی میر،نکات الشعرا،مرتبہ:مولوی عبدالحق،اورنگ آباد:انجمن ترقی اُردو،۱۹۳۵ء۔

۶۔ Rai. Amrit, *A House Divided: The origin and Development of Hindi/Hindvi*, Delhi: Oxford University Press, 1984.

☆☆☆